متاع کاروان

از "ساربان"

[ذیل کا مضمون ماہ شوال کی اشاعت کے لیے رکھا گیا تھا۔ مگر رمضان اور کثرت کار نے مل جل کر ایڈیٹر کو بیماری کے سرے پر پہنچا دیا ہے۔ لہٰذا دوسرے مضامین کو ملتوی کر کے اسی پرچے میں اسے شائع کیا جا رہا ہے۔]

بصارت کے ساتھ بصیرت رکھنے والوں کی نگاہوں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ وہ محکم چٹان جس کی بنا پر ایک قوم دنیا میں اپنی ہستی کو قائم رکھ سکتی ہے، اور دنیا کی ہر وہ رَو جو اسے اپنے ساتھ بہالے جانے کے لیے بڑھے، اس سے ٹکرا کر نامراد رہ جاتی ہے، اس قوم کی قوت ایمانیہ ہے جس قدر یہ قوت زیادہ ہوگی اسی قدر قوم دنیا کے ہر سیلاب کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوگی۔ قوت ایمانی سے مراد دراصل ایمان کی قدر و قیمت ہے۔ اور چونکہ یہ ایک خارجی شئے نہیں بلکہ قلبی کیفیت کا نام ہے اس لیے ایمان کی قیمت کوئی باہر کا خریدار مقرر نہیں کر سکتا بلکہ خود بیچنے والا ہی اس کی قیمت مقرر کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے نزدیک یہ اتنی حقیر شے ہو کہ وہ اسے ایک روٹی کے ٹکڑے کی خاطر بلا دریغ بیچ ڈالے۔ اور دوسرے کے نزدیک یہ متاع اتنی گراں بہا ہو کہ خدائے ارض و سما سے ورے کوئی گاہک اس کی نگاہوں میں جچتا ہی نہیں اور وہ اگر دونوں جہاں بھی اسے دیدے تو یہ اس شرم کے مارے چپ ہو رہے کہ اب تکرار کیا کریں۔ یہی وہ قوت ہے جس سے مسلمان کے دل میں وہ بے پناہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ خدا اور رسول کی قائم کی ہوئی تہذیب و ثقافت کو برقرار رکھنے کے لیے ہر بڑی سے بڑی قربانی کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ مسلمان سے جب دنیا کی ہر طاقت دبتی تھی، تو وہ اس کی تمشیر زنی یا نیزہ افگنی کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ اس لیے کہ اس کی متاع

ایمان کو کوئی کسی قیمت پر بھی خرید نہیں سکتا تھا

لہٰذا جن قوموں نے مسلمانوں کو زیر کرنا چاہا، وہ مدت عمر کے تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچیں کہ ان کے ہاتھوں سے تیغ و سنان کا چھین لینا اس قدر مفید اور ضروری نہیں جس قدر کہ ان کے دل و دماغ سے متاع ایمان کی قیمت و اہمیت کو کم کر دینا۔ دیگر ممالک اسلامیہ کا ذکر چھوڑ گیا تو یہ داستان بہت طویل ہو جائے گی اس لیے سردست ہم صرف اتنا دیکھیں گے کہ ہندوستان کے مسلمان کی نگاہوں میں اس کی متاع ایمان کو ایک جنگل سدا سہرانے کے لیے کیا تدابیر عمل میں لائی گئیں۔ اور پھر اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ آج اس متاع کو چھیننے کے لیے کیا کیا حربے استعمال کیے جا رہے ہیں۔

آپ کو شائد معلوم ہوگا کہ ابھی ایسٹ انڈیا کمپنی ایک تجارتی ادارہ سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی، کہ سیرام پور میں سب سے پہلا مشن (William Carey) اور اس کے رفقاء کار Ward اور (Marshman) کی زیر نگرانی قائم ہو گیا تھا اور انہوں نے ۱۷۹۳ء میں یہاں سب سے پہلا کالج قائم کیا تھا۔ اس وقت ایک کمپنی اسے قرین مصلحت نہ سمجھتی تھی کہ ایسی جماعتوں کو کھلم کھلا اپنی سرپرستی میں لے لے۔ کیونکہ حالات اس کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اسی لیے جب چارلس گرانٹ نے چاہا کہ پارلیمنٹ سے کمپنی کے دساتیر میں اس شق کا اضافہ کرا لیا جائے تو اسے ناکامی ہوئی، حالانکہ ولیم ولبر فورس جیسا صاحب اثر مدبر بھی اس کا حامی تھا۔ لیکن ۱۸۱۳ء میں جب کمپنی کے چارٹر میں تجدید ہوئی تو اس وقت اس میں اس شق کا اضافہ کرا لیا گیا۔ اس کے بعد مردانہ اور زنانہ مشن سکول ملک کے طول و عرض میں قائم ہو گئے۔ اکیلے چرچ آف انگلینڈ کی طرف سے تقریباً بیس اسکول کھل گئے۔ اور پبلک کے چندہ سے جو انگلستان میں جمع ہوا ۱۸۲۰ء میں کلکتہ میں بشپ چرچ کالج کا افتتاح ہوا۔ ۱۸۴۹ء میں کلکتہ میں سب سے پہلا زنانہ مدرسہ کھولا گیا۔ پریس کے افتتاح نے مشن کی ان تدابیر میں اور بھی تقویت پیدا کر دی۔ پنجاب اور یوپی میں بیسیوں ایسے مرکز قائم ہو گئے جن سے مشن کے لٹریچر کی اشاعت ہوتی تھی۔ سیرام پور مشن کا

پہلا ہفتہ وار اخبار "سماچار درپن" انہی مقاصد کا آئینہ دار تھا۔

ان عیسائی مشنوں کو "عیسائیت" پھیلانے میں تو کوئی قابل لحاظ کامیابی ہوئی نہیں، البتہ انہیں اس باب میں یقینی کامیابی حاصل ہوگئی کہ لوگوں کے سامنے جب "مذہب" کا نام لیا جائے، تو ذہن ایک ایسے نظریہ کی طرف منتقل ہو جائے جس میں عقل کو کوئی دخل نہ ہو، وہ سرتاسر توہم پرستی، بے دلیل عقیدت، اندھے یقین اور جاہلانہ تعصبات کا مجموعہ ہو، اور عملی دنیا میں وہ ایک قدم بھی انسان کے ساتھ نہ چل سکے۔ ایک طرف تو مذہب کا ایسا تصور رچایا گیا، اور دوسری طرف ڈیوڈ ہیر David Hare جیسے معقولی (Rationalist) نے ۱۸۱۶ء میں پریزیڈنسی کالج، کلکتہ کی بناڈالی جسے آزادخیالی کی تحریک کا گہوارا سمجھنا چاہیے۔ یہ دونوں قوتیں متوازی کام کرتی رہیں۔

اس کے بعد وہ تحریک شروع ہوئی جسے "انگریزی ذریعہ تعلیم کی تحریک" کہتے ہیں۔ ۱۸۲۹ء میں الگزنڈر ڈف نے چاہا کہ ایک ایسا اسکول کھولا جائے جس میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہو۔ اگرچہ اس وقت کی حکومت نے مصلحتاً اس کی مخالفت کی مگر ۱۸۳۹ء میں لارڈ میکالے کو اس امر کی تحقیق کیلیے متعین کیا گیا کہ طریق و ذریعہ تعلیم کیا ہونا چاہیے۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم کے حامی اپنے خیال کی تائید میں یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ اس سے ایک ایسی قوم پیدا ہو جائیگی جو رنگ اور خون کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوگی لیکن مذاق، خیالات، اخلاق اور ذہنیت کے لحاظ سے انگریزی ہوگی۔ چنانچہ اس دلیل کو وزنی سمجھا گیا، انگریزی ذریعہ تعلیم قرار دی گئی، اور لارڈ ہیٹنگر نے ۱۸۴۴ء میں اعلان کر دیا کہ سرکاری ملازمت کے لیے انگریزی خوان کو ترجیح دی جائے گی۔

ایک طرف انگریزی زبان کی اشاعت و ترویج کے لیے یہ کچھ کیا جا رہا تھا۔ دوسری طرف عربی اور فارسی کو مٹانے کے لیے بھی کچھ کم قوتیں صرف نہیں ہو رہی تھیں۔ مسلمانوں کو لائبریریوں سے خارج کیا جاتا رہا۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز نے حکم دیدیا کہ سامی ثقافت کی ریسرچ میں ایک پائی بھی صرف نہ کی جائے۔ ڈاکٹر روئر Roer جو ایشیاٹک سوسائیٹی کا ۱۸۴۷ء سے

سنہ ۵۲ء تک انچارج رہا، اور اس کے بعد پال وغیرہ نے یہ مہم کوشش جاری رکھی کہ عربی کی طرف سے توجہات ہٹا کر سنسکرت کی ترویج و احیاء میں تمام روپیہ صرف کیا جائے یہ ظلم و تعصب اس حد تک بڑھ گیا کہ مسلمانوں کے وہ اوقاف تک جو خاص انہیں کیلیے وقف تھے غیر مسلموں کی تعلیم میں صرف ہونے لگے چنانچہ محسن ٹرسٹ پریذیڈنسی کالج کلکتہ پر صرف ہونے لگا جو قریب قریب ہندو کالج تھا۔ اعتماد الدولہ ٹرسٹ کا بھی یہی حال ہوا۔ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم اور قدیم زبانوں کی تخریب کی گئی اور ستم یہ کہ ان کے لیے جدید تعلیم حاصل کرنے کے راستہ میں بھی سخت موانع حائل کیے گئے۔ لارڈ ھیسٹنگز کا سرکاری اعلان ہم دیکھ چکے ہیں کہ ملازمتوں میں انگریزی خوان کو ترجیح دی جائے گی۔ لیکن دوسری طرف ڈاکٹر ہنٹر (Hunter) کے الفاظ میں "کوئی مسلمان قلی، یا دفتری، یا قلم بنانے والے کی اسامی سے اوپر کسی اسامی کا متوقع نہیں ہو سکتا تھا۔" اور اس طرح اسی ڈاکٹر کے الفاظ میں "بتدریج اسلامی ہند دار الحرب بنا دیا گیا، اور ایک عظیم الشان روایات کی حامل قوم دنیا میں یوں بے وقعت کر کے رکھ دی گئی"۔ سلطنت چھن گئی۔ جماعت کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ اسلامی قوانین معطل ہو گئے، اسلامی تہذیب کو سہارا دینے والی تعلیم بھی باقی نہ رہی۔ ساری قوم میں جہالت پھیلتی چلی گئی۔ اور اس پر مزید یہ کہ اس کو پیٹ کی مار دی گئی معیشت کے دروازے اس پر ایک کر کے بند کیے گئے اس کو ان لوگوں کے آگے ذلیل و خوار کیا گیا جو کل تک خود اس کے محکوم تھے۔ اور اس کو ایک قلیل مدت کے اندر فقیروں اور قلانچوں کی قوم بنا کر رکھ دیا گیا۔ اس طرح مسلمان کے ایمان کی قیمت گرنی شروع ہوئی اور وہ رفتہ رفتہ مارکیٹ میں ایک جنس فروختنی کی حیثیت سے آگیا۔

الزام دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے ملانوں نے بعض انگریزی پڑھنے سے ... کہ گویا

۱۔ The Indian Musalmans by Dr. Hunter.

اس لیے یہ قوم تعلیم میں پیچھے رہ گئی لیکن مذکورۂ صدر واقعات کو سامنے رکھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ مسلمانوں کو تعلیم سے روکنے والے اُن کے مُلّانے تھے یا ایک منظم سکیم تھی؟" مُلّا نے "جو یوں بدنام کیے جاتے ہیں، اُن کی تو یہ حالت تھی کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ نے فتویٰ دیا تھا کہ "انگریزی پڑھنا، علوم جدیدہ کا حاصل کرنا اسلام کی روایات اور روح کے بالکل مطابق ہے" علماء حضرات کو تو مفت میں مورد الزام ٹھیرایا جا رہا ہے۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق کے لیے ذیل کے اعداد وشمار ملاحظہ فرمائیے اور خود نتیجہ اخذ کر لیجیے کہ مسلمان تعلیم جدید سے بھاگتے تھے، یا تعلیم کے دروازے ہی اُن پر مسدود کر دیے گئے تھے؟ ۱۸۸۲ء میں پنجاب کی تعلیمی رپورٹ کا خلاصہ حسب ذیل تھا۔

	ہندو	مسلمان
ابتدائی تعلیم	۲۳۰۷۴	۱۶۴۴۵
ثانوی (مڈل)	۵۸۰۹	۲۷۴۴
ہائی اسکول	۱۴۱	۴۶
کالج	۹۱	۶
لڑکیاں	۵۷۱	۲۵۷۶

ملاحظہ فرمائیے! ابتدائی حصہ میں تیئس ہزار ہندوؤں کے مقابلہ میں ۱۶ ہزار مسلمان ہیں۔ آگے چل کر مڈل میں پانچ ہزار کے مقابلہ میں دو ہزار رہ جاتے ہیں۔ ہائی اسکول میں تقریباً ڈیڑھ سو کے مقابلہ میں چھیالیس (ایک تہائی)، اور کالج میں قریب پندرھواں حصہ۔ لڑکیوں کی تعداد بھی قابل غور ہے، لیکن مسلمان لڑکیوں کی یہ تمام کثرت صرف ابتدائی مرحلہ میں نظر آتی ہے۔

مختلف سیاسی موانع کے علاوہ مسلمانوں کے راستے میں مذہبی مُلّا بھی بڑی رکاوٹ پیش کر رہا تھا، یہ بات نہیں ہے کہ ان کا مذہب انہیں تعلیم جدید سے روکتا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ

تمام مدرسے عیسائی مشنریوں کے تھے۔ اور وہاں اُن بچوں کو عیسائیت کی تعلیم دیکر انہیں اسلام سے ورغلایا جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۶۵ء کا واقعہ ہے کہ حیدرآباد (سندھ) کے ایک مدرسہ میں ایک مسلمان بچے کو عیسائی بنایا گیا، اور دوسرے ہی دن دو سو مسلمان بچوں نے اسکول چھوڑ دیا۔

یہ تھے وہ حالات جن کے تحت یہاں نئی تعلیم کا اجرا ہوا۔ دل میں درد، آنکھوں میں بینائی اور دماغ میں فہم و ادراک رکھنے والا مسلمان اِن حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور کلیجہ مسوس کے رہ جاتے تھے لیکن اس وقت بھی خدا کے ایسے بندے موجود تھے جو مسلمانوں کی متاعِ ایمان کو یوں دن دہاڑے لٹتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے حضرت شاہ ولی اللہ رح اور ان کے خاندان کو (علیہم الرحمہ) جنہوں نے ایسے سخت وقت میں اس روش کے خلاف مقابلہ کا عزم کیا۔ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ کی زیرِ قیادت اس تحریک عظیم کی بنیاد پڑی جسے "تحریک محمدیہ" کہتے ہیں۔ حضرت سید احمد بریلوی، شاہ اسمٰعیل شہید، شاہ عبدالحی (علیہم الرحمہ) اس تحریک کے علمبرداروں میں سے تھے۔ ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں کہ اس تحریک کے سیاسی گوشے کون کونسے تھے اور اُن کا کیا انجام ہوا، ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ مسلمانوں کے تحفظ تہذیب و ثقافت کے مسئلہ پر اس تحریک کے عواقب کس حد تک اثر انداز ہوئے۔ "وہابی تحریک" کے استیصال کے لیے جو افسر اعلیٰ (James O'Kineaty) متعین کیا گیا تھا، اُس نے اپنی رپوٹ میں لکھا کہ اِن مذہبی سرفروشوں کا عوام پر اثر اس لیے غالب ہے کہ ہم نے عوام میں تعلیم پھیلانے سے تساہل برتا ہے۔ چنانچہ مسٹر بیلی (Bayley.) ہوم سکرٹری نے گورنمنٹ کی پالیسی بدلنے کے لیے جو خریطہ لکھا اس میں اس بات کو واضح کر دیا کہ مسلمان انگریزی حکومت میں یقیناً تباہ ہو چکے ہیں لیکن حکومت کی پالیسی میں تبدیلی ہونی ضروری ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ان کی تباہی تو مسلّم ہے لیکن اس قسم کی تحریکیں جو پیدا

ہوتی جاتی ہیں، ان کے استیصال کے لیے یہ ضروری ہے کہ اب انہیں تعلیم دی جائے نوکریوں کے دروازے اب ان کے لیے کھولدیے جائیں، تاکہ ان کی "جہالت" جو ابھی تک ان کے دل میں جوش ایمانی کے ولولے زندہ رکھے ہوئے ہے، "علم کی روشنی" میں تبدیل ہو جائے، جس سے عشقِ بلا انگیز پر عقل حیلہ جو کا غلبہ ہو جائے۔ چنانچہ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے اسکول اور کالج کھلنے شروع ہو گئے اور یہ "وحشی" بھی "مہذب" بنا لیے گئے۔ علی گڑھ اور حمایت اسلام لاہور اسی تبدیلی کا ثمرہ تھے۔

ڈیڑھ سو سال کی تاریخ چند اشارات میں بیان نہیں کی جا سکتی، اور تاریخ نگاری اس وقت ہمارے پیش نظر ہے بھی نہیں ہیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ مسلمانوں کی متاع ایمان کی قیمت گرانے اور پھر اسے سستے داموں خریدنے کے لیے اس سو سال کے عرصہ میں کیا کیا عنوانات قائم کیے گئے تھے جن کا آج یہ اثر ہے کہ ایک نوجوان کو راستہ چلتے میں اپنے جوتے کی ایڑی گھسنے کا تو خیال ہوتا ہے لیکن ایمان گھٹنے کا کبھی خیال نہیں آتا ہم نے دیکھا ہے کہ جو کچھ اس باب میں کیا گیا ہے وہ چند الفاظ میں یہ ہے کہ:۔

۱۔ مسلمان کو اس کے مذہب سے متنفر یا کم از کم بیگانہ بنا دیا جائے۔

۲۔ معاش کے دروازے اس پر بند کر دیئے جائیں تاکہ روٹی کا سوال اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو جائے اور یہی چیز اس کی نگاہ میں سب سے زیادہ گراں قدر بن کر رہے۔

۳۔ اس کی تہذیب و تمدن کی زبان کو مٹا کر اس کی جگہ حاکم قوم کی زبان کو ترویج دی جائے۔

جب یہ ہو جائیگا تو مسلمان کے قلب و دماغ کی کایا پلٹ جائے گی۔ مذہب سے بیگانہ ہو گا تو اس کی مرکزیت فنا ہو جائے گی۔ معاش کے دروازے بند ہوں گے تو روٹی کے ٹکڑے پر اسے خریدا جا سکے گا۔ زبان دوسری رواج پا جائے گی تو اس کے ذریعے سے غیر محسوس طور پر، بتدریج دوسروں کی تہذیب اس کی ذہنیت پر اپنا رنگ جما دے گی، اور جب ذہنیت بدل جائے گی تو سب کچھ بدل جائیگا

یہ ماضی کا قصہ تھا۔ اب ذرا حال کی باتیں سنیے تاکہ مستقبل کی تباہی آپ پر خود بخود کھل جائے۔

آج ہندوستان میں پھر ایک تحریک بڑھ رہی ہے، جس کا مقصد حکومت کرنے والے ہاتھوں کی تبدیلی ہے اور اس تحریک کے بانیوں کو بھی وہی سوال پریشان کر رہا ہے جس نے ان کے پیش رووں کو پریشانی میں ڈالا تھا، یعنی ہندوستان میں ایک قوم ایسی ہے جو اس قدر پس جانے کے باوجود اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھنے کا داعیہ رکھتی ہے۔ او جل کر راکھ ہو جانے پر بھی اس میں ابھی بہت سی چنگاریاں باقی ہیں جو ہر وقت بھڑک سکتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بھی اسی ڈھنگ پر سوچنا شروع کیا ہے۔ جس ڈھنگ کبھی ان کے آقاؤں نے سوچا تھا اور خوب سوچ سمجھ کر گذشتہ ڈیڑھ سو سال کی تاریخ سے سبق حاصل کر کے انہوں نے بھی مسلمان کی شخصیت کے استیصال کے لیے بالاخر وہی تین عنوان قائم کیے ہیں جو اس سے پیشتر وضع کیے گئے تھے کہ:۔ ؎

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریف پنجہ فگن نئے ⁂ وہی فطرت اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

سب سے پہلا عنوان یہ ہے کہ انھیں مذہب سے متنفر یا بیگانہ بنایا جائے۔ تحریک آزادی کی قیادت آج ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہے جو خدا کا منکر ہے، مذہب کا دشمن ہے، روس کے الحاد و دہریت کا پرستار ہے، اس لیے وہ ہر جگہ یہی پرچار کرتا پھرتا ہے کہ غلامی اور محتاجی کی تمام مصیبتیں مذہب ہی کی پیدا کردہ ہیں، جب تک مذہب دفن نہیں ہوتا،" قوم کو ہوش نہیں آسکتا۔ اس کا اثر ظاہر ہے۔ ہزار ہا نوجوان جو تحریک آزادی کے اس "قائد اعظم" کو اپنی امیدوں اور تمناؤں کا کعبۂ مقصود سمجھے بیٹھے ہیں مذہب کو علانیہ گالیاں دیتے پھرتے ہیں۔ جو ذرا ان سے متین ہیں یا یوں کہیے کہ جن میں جوانی کا جوش باقی نہیں رہا ہے وہ ہندوستانی پہلے اور مسلمان بعد ہونے کے مدعی ہیں۔ زیادہ صاف الفاظ میں وہ "بھارت ماتا پہلے، اور خدا بعد کو" کا عقیدہ رکھتے ہیں، اور پھر بھی یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ ان کے علاوہ جو لوگ مذہب کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ وہ بھی مذہب کے متعلق بس اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ یہ عابد و معبود

کے درمیان ایک قلبی تعلق کا نام ہے۔ اس کو دنیاوی زندگی کے معاملات میں دخل انداز نہیں ہونا چاہیے۔ اور ایسا کہتے ہوئے وہ قطعاً محسوس نہیں کرتے کہ وہ اسلام سے کس قدر بُعد و بیگانگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ رو بڑھتی جا رہی ہے، اور اس سے تحریک وطن پرستی کے لیڈروں کا صاف منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس کھیتی میں ان کے پیش رو (انگریز) تخم ریزی کر چکے ہیں اسی کھیتی کی فصل یہ تیار کرنا اور کاٹنا چاہتے ہیں۔

آپ کہہ دیں گے کہ اس میں مسلمانوں کی کیا تخصیص ہے۔ اس قسم کا پروپیگنڈا ہندوؤں میں بھی تو ہو رہا ہے۔ اور ہندو نوجوان بھی تو اپنے مذہب سے متنفر ہوتے جا رہے ہیں پھر آخر ہندوؤں کو اس تحریک وطن پرستی کے خلاف وہ شکایت کیوں نہیں پیدا ہوتی جو تمہیں ہوتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ "ہندو" کسی مذہب کا نام ہی نہیں ہے۔ وہ تو دراصل ایک نسلی قومیت کا نام ہے جو چند مخصوص قومی روایات کے زیر اثر صدہا برس سے پرورش پاتی رہی ہے۔ اس نسلی قومیت کے دائرے میں خواہ کتنے ہی مختلف اور متضاد عقائد اور اصول حیات داخل ہو جائیں اس کو کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ بقول پنڈت جواہر لال نہرو کے:-

"ہندومت کے دائرے میں بے حد مختلف اور متضاد خیالات اور رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندومت پر صحیح معنی میں لفظ مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا..... ممکن ہے کہ ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو (جیسے قدیم فلسفی چارواک تھے) لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں، ہندومت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور میرے اعمال کچھ ہی ہوں" (ملاحظہ ہو پنڈت جی کی خود نوشت سوانحعمری ترجمہ اردو جلد اول صفحہ ۲۰۲ و ۲۰۳)۔

چونکہ ہندویت کی بنیاد کسی عقیدے اور کسی خاص نظام تہذیب و اصول حیات پر نہیں ہے، اس لئے وہ بیسیوں مختلف و متضاد مذہبی خیالات اور زندگی کے طور طریقوں کو اپنے دائرے میں لے چکی ہے اور پھر بھی "ہندو بیت" ہے، آئندہ بھی لے سکتی ہے اور پھر بھی ہندویت رہ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الحاد و دہریت اور اشتراکیت کے انتہائی انقلابی نظریات ——— اخلاقی، تمدنی، معاشی سب قسم کے نظریات ——— پھیلنے پر بھی ہندویت کے سخت سے سخت علمبرداروں تک کو کوئی اعتراض نہیں ہے، کیونکہ ان سب کے باوجود ان کی قومیت جوں کی توں برقرار رہتی ہے۔ خلاف اس کے مسلمانوں کی قوم بنی ہی مذہب کے خمیر سے ہے۔ ایک عقیدہ کا اشتراک، ایک قسم کے طریقہائے عبادت کا اشتراک، ایک قسم کے اخلاقی تصورات کا اشتراک، ایک طرح کے ضابطہ زندگی کا اشتراک، یہی سب چیزیں مل کر اس قوم کو ایک قوم بناتی ہیں۔ ایک سرحدی پٹھان، ایک راجپوت، ایک جاٹ، ایک سندھی، ایک بنگالی، ایک گجراتی، ایک مالاباری اور ایک مدراسی مسلمان کے درمیان کوئی رشتہ باقی ہی نہیں رہتا اگر اس مذہبی اشتراک کا رشتہ درمیان سے ٹوٹ جائے۔ اگر اعتقادات اسلامی سے وہ منکر ہو جائیں، اسلام کے اخلاقی اصول چھوڑ دیں، اسلامی زندگی کے بنیادی قواعد کی پابندی ترک کردیں، اور مذہبی اخوت و برادری کے تعلق کو منقطع کر کے معاشی طبقات میں تقسیم ہو جائیں اور آپس میں روٹیوں پر لڑنے لگیں تو سمجھ لیجیے کہ مسلمان قوم دفعۃً صفحۂ ہستی سے مٹ گئی اور اس کے اجزا منتشر ہو کر دوسری قوموں میں جذب ہو گئے۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو مسلمان کچھ عقل رکھتے ہیں، انھیں اس تحریک سے کیا خطرہ ہے اور اب یہ بات بھی آپ کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ لاکھوں متعصب مہاسبھائی جن سے چند سال پہلے تک سارا ہندوستان بھرا ہوا نظر آتا تھا، دفعۃً کہاں غائب ہو گئے اور کیوں غائب ہو گئے۔ کوئی انتہا درجہ کا بے وقوف مہاسبھائی ہو گا جو اب اس "فرقہ وارانہ" جماعت یعنی مہاسبھا میں

شامل رہ کر اپنی پوزیشن خراب کرے گا۔ عقلمند مہاسبھائی جتنے تھے سب بفضل خدا خنگ آزادی میں شریک ہیں

آپ غور سے دیکھیں گے تو نظر آجائیگا کہ موجودہ تحریک گذشتہ تحریک (یعنی انگریزی سامراج کی تحریک) سے کہیں زیادہ گہری اور زود اثر ہے پہلی تحریک نے تو کہیں ڈیڑھ سو سال میں اتنا اثر کیا کہ کالجوں سے نکلنے والے صاحبزادوں کے دماغ ماؤف کر دیے۔ لیکن اس تحریک کا اثر تو آپ کے بڑے بڑے قدامت پسند علماء تک پہنچ گیا ہے۔ ایمان کی قیمت و اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان، اسلام کو تمام مذاہب سے افضل سمجھے اور نوع انسانی کی نجات و سعادت کا واحد اور آخری ذریعہ خیال کرے۔ اور یہ خیال محض خوش عقیدگی یا تعصب کی بنا پر نہیں، بلکہ از روئے قرآن حقیقت نفس الامری کی حیثیت سے ہو۔ لیکن جب ایک مسلمان یہ کہنا شروع کر دے کہ دیگر مذاہب کی پابندی سے بھی اسی طرح نجات حاصل ہو سکتی ہے جس طرح اسلام کے اتباع سے تو یہ گویا اس بات کا اقرار ہے کہ مسلمان اگر مسلمان کی حیثیت سے نہ بھی زندہ رہے تو بھی کوئی مضایقہ نہیں وہ اگر غیر مسلم قوموں میں جذب ہو گیا تو نجات و سعادت سے محروم نہیں رہ سکتا۔ اس اعتراف کی زندہ شہادت مہاتما گاندھی کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے چند سال ادھر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ہال میں مسلمانوں کے اجتماع میں کی تھی انہوں نے فرمایا: —

"مجھے ایک عرصہ سے خیال تھا۔ کہ قرآن کبھی نجات و سعادت کے لیے اسلام ہی کو واحد ذریعہ قرار نہیں دے سکتا، بلکہ اس کی رو سے ہر مذہب کا انسان اپنے اپنے طریقہ پر کاربند رہ کر نجات حاصل کر سکتا ہے۔ مجھے اس کے ثبوت کی ضرورت تھی۔ آخر کار مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب "ترجمان القرآن" میں (جس کی پہلی جلد اس وقت شائع ہوئی تھی) اس بات کو ثابت کر دیا کہ میرا خیال صحیح ہے۔ چنانچہ ہم نے ترجمان القرآن کے ان حصوں کا

گجراتی زبان میں ترجمہ کرکے شائع کیا ہے"۔

آپ سمجھے بھی کہ یہ اتنے مشہور عالم دین امام الہند کی کس خدمت جلیلہ کا تذکرہ ہو رہا ہے؟ یہ وہ ذہنیت جو ایک مستقل مقصد کو سامنے رکھ کر مسلسل نشر و اشاعت کے ذریعہ سے ہندوستان بھر میں پھیلائی جا رہی ہے۔ اور اس کی سند مسلمانوں کے اتنے بڑے عالم سے حاصل ہو رہی ہے مسلمان کو اس کے مذہب سے بیگانہ کرنے کے لیے۔ اس سے بڑھ کر اور کونسا حربہ کارگر ہو سکتا ہے۔ اور قیامت ہے کہ اس "جہاد عظیم" میں مسلمانوں کے اتنے بڑے بڑے نامور لوگ اس دلیری سے حصہ لے رہے ہیں۔

دوسرا مسئلہ روٹی کا ہے۔ اس باب میں انھیں کچھ زیادہ دشواری نہیں پیش آ رہی ہے۔ ان کے مورث ان کے لیے اس کھیتی کو بھی ڈیڑھ سو سال کی تخم ریزی و آب پاشی کے بعد بڑی حد تک تیار کر چکے ہیں۔ اب صرف فصل کاٹنے کی زحمت ہی ان کے لیے باقی ہے۔ دیوانی بنگال کی سند حاصل کرنے کے بعد سے انیسویں صدی کے آخر تک جس طرح مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے تباہ و برباد کیا جاتا رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت مسلمان ہی ہندوستان کی سب سے زیادہ بھوکی قوم ہے۔ اور اس کی بھوک ہی کو دیکھ کر یہ امید قائم کی گئی ہے کہ صدر کانگریس کی اشتراکی فوج میں سب سے بڑھ کر مسلمان حصہ لیں گے جو بھوک کے شکار ہیں اور جن کو جدید تعلیم نے اپنے مذہب سے بیگانہ، بلکہ ایک حد تک متنفر بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہماری قوم کے بہت سے اشتراکی نوجوان بے باکانہ کہتے پھرتے ہیں کہ کہاں کی تہذیب اور کیسی کلچر۔ سوال سارا دنیا میں پیٹ کا ہے جو اسی "متحدہ فوج" کے بل بوتے پر صدر کانگریس کو یہ کچھ کہنے کی جرأت ہو گئی ہے کہ میں کسی مخصوص تہذیب اور مخصوص تمدن کو نہیں جانتا۔ میں تو صرف دو باتیں جانتا ہوں۔ جمہور ہندوستانی اور ان کا افلاس۔ بے روزگار نوجوان ان الفاظ کو سنکر جوش مسرت سے دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اور دل میں سمجھ لیتا ہے کہ بس

ہندوستان کی تمام مصیبتوں کا علاج اسی نظریہ میں ہے اور ان کا نجات دہندہ وہی ہے جو اس نظریہ کا پیش کرنے والا ہے۔ حالانکہ وہ ذرا غور سے دیکھے تو اسے نظر آجائے کہ ہندوستان کے یہ سب سے بڑے کمیونسٹ، یہ تمام انسانوں کو معاشی مساوات دلانے کے حامی، یہ کہ جن کے دل گویا مفلسوں محتاجوں کی ہمدردی کے رستے ہوئے ناسور بن گئے ہیں؛ دراصل خود سرمایہ دار ہیں، زمیندار ہیں، کارخانہ دار ہیں، سود خوار ہیں، بورژوا ہیں، اور ان کی اشتراکیت محض سٹیج کی اشتراکیت ہے جس کا مقصد محض بھوکے نوجوانوں کو اپنے دام میں پھانسنا اور مسلمانوں کے درمیان الحاد اور طبقات کی جنگ برپا کرکے ان کی قومیت اور تہذیب دونوں کو ختم کر دینا ہے۔ کلکتہ کی آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں اور کانپور و احمد آباد کی ہڑتالوں میں اور وزارت مدراس کی حمایت میں اس اشتراکیت کی حقیقت خوب ظاہر ہو چکی ہے۔

تیسرا مسئلہ زبان کا ہے مسلمان عموماً اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور اس غلط فہمی میں انہیں اور زیادہ مبتلا کیا جا رہا ہے کہ زبان کا مسئلہ محض ایک ادبی اور تمدنی مسئلہ ہے۔ اس کا کوئی تعلق، کم از کم کوئی خاص تعلق کسی قوم کے مذہب اور تہذیب سے نہیں ہے لیکن یہ خیال جس قدر جلدی دور ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ قومیت کو بنانے اور بگاڑنے میں، تہذیب کو زندہ رکھنے اور فنا کر دینے میں، قومیت کا مذہب سے تعلق باقی رکھنے اور منقطع کر دینے میں زبان کا اثر غیر معمولی ہے۔ جس قوم کے پاس اپنی زبان اور اپنا رسم الخط ہے وہ ایک مستقل قوم ہے اور جس قوم کی زبان میں خود اپنا لٹریچر موجود ہے اور ترقی کر رہا ہے وہ ایک زندہ قوم ہے۔ جس وقت وہ اپنی زبان و رسم الخط کو بدل دینے پر آمادہ ہو جائے اس وقت سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اپنی قومیت کو بدل رہی ہے اور اپنی تہذیب سے رشتہ منقطع کر رہی ہے۔ اس باب میں اگر کوئی شہادت آپ کو درکار ہو تو میں پنڈت جواہر لال نہرو ہی کو گواہوں کے کٹہرے

میں لاکر کھڑا کردونگا۔ وہ اپنے ایک تازہ مضمون میں فرماتے ہیں:۔

"ایک قوم کے لیے زبان کا مسئلہ ہمیشہ بڑا اہم رہا ہے۔ آج سے تین سو برس پہلے ملٹن نے فلورنس سے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے اس کی اہمیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔ کسی قوم کے اپنی ایک زبان رکھنے کو، خواہ وہ زبان بگڑی ہوئی ہو یا خالص ہو، ایک غیر اہم سا واقعہ نہ سمجھ لینا چاہیے، اور نہ اس امر کو کہ اس کے افراد زبان کے برتنے میں صحت کا کہاں تک لحاظ رکھتے ہیں۔ ..... کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ کوئی سلطنت یا مملکت اس وقت تک اوسط درجے کی خوشحالی و فلاح سے محروم کردی جاسکتی ہو جس وقت تک کہ اس کے افراد اپنی زبان کو پسند کرتے اور اسکی طرف کافی توجہ کرتے رہے ہوں"۔

ایک دوسری جگہ پنڈت جی فرماتے ہیں۔

"رسم الخط کا اور ادب کا بہت ہی گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس کا ماضی شاندار رہا ہو۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں، آوازیں بدل جاتی ہیں، اور خیالات بدل جاتے ہیں۔ قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار حائل ہوجاتی ہے اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہوچکی ہے" (میری کہانی۔ جلد اول ص ۲۹۵)

اگرچہ زبان اور رسم الخط کی اہمیت پر بہت سی ایسی شہادتیں بھی نقل کی جاسکتی ہیں جو علمی حیثیت سے نسبتہً زیادہ وقیع ہیں۔ مگر میں نے قصداً یہ شہادت اس لیے نقل کی ہے کہ آگے چل کر ہندوستان کی زبان کے متعلق انہی جواہر لال اور انہی کے ہم خیال معمارانِ وطن کی جن کارگذاریوں کا ذکر میں کرنا

چاہتا ہوں ان کو پڑھتے وقت ناظرین کو یہ معلوم رہے کہ یہ لوگ زبان اور رسم الخط کی اہمیت سے ناواقف نہیں ہیں بلکہ اس کا پورا شعور رکھتے ہیں، اور خوب سوچ سمجھ کر وہ طرز عمل اختیار کر رہے ہیں جس کی تشریح میں آگے کرنے والا ہوں۔

اردو زبان اگرچہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے، ان دونوں قوموں کے سیاسی و تمدنی وفاق کا ایک بڑا ذریعہ ہے، ان کے درمیان باہمی مفاہمت کا بہترین وسیلہ رہی ہے اور بن سکتی ہے، اور اس لحاظ سے ہندوستان کے آئندہ سیاسی ارتقا کی شکل کو بنانے یا بگاڑنے میں اس زبان کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، لیکن یہ ایک بڑی غلطی ہوگی اگر ہم اس کی اہمیت کو صرف اسی حد تک محدود رکھیں۔ ہندوؤں کے لیے اس زبان کی زندگی و موت ان کی قومیت اور ان کی تہذیب کی زندگی و موت کا حکم نہیں رکھتی۔ شمالی ہند میں ان کی ایک بڑی تعداد اس کو بولتی اور لکھتی پڑھتی ہے، مگر ان کی قومیت اور تہذیب کے لیے زندگی کا صرف یہی ایک سہارا نہیں ہے۔ بخلاف اس کے مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں صرف یہی ایک زبان ہے جس کی بدولت ان کی قومیت اور ان کی تہذیب زندہ ہے اور رہ سکتی ہے۔ یہی زبان تمام اقطاع ہند کے مسلمانوں میں وحدت قائم کرتی ہے۔ اسی زبان کے ذریعہ سے مسلمانوں کا تعلق اپنے ماضی کیساتھ قائم رہتا ہے۔ اسی زبان کا رسم الخط ان کو قرآن کے رسم الخط سے قریب تر رکھتا ہے۔ اسی زبان میں وہ الفاظ اور اسالیب بیان پیدا ہو گئے ہیں جو اسلامی خیالات کو ادا کرنے کے لیے مناسب ہیں، اور جن کے ذریعہ سے بولنے والوں اور سننے والوں میں اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی ہے۔ عربی زبان کے بعد دنیا میں کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں اسلام، اس کی تاریخ اور تہذیب کے متعلق اتنا لٹریچر موجود ہو جتنا اس زبان میں ہے۔ قلیل التعداد عربی دانوں کے سوا مسلمانان ہند کی عظیم اکثریت کے لیے اس لٹریچر سے واقف ہونے کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے۔ اگر یہ زبان بدل جائے یا اس کے الفاظ

اور اسالیب بیان بدل جائیں یا اس کا رسم الخط بدل جائے تو مسلمان اس ملک میں بحیثیت ایک قوم کے باقی نہیں رہ سکتے جس طرح چین میں باہر سے متعدد قومیں فاتحانہ داخل ہوئیں اور وہاں کی زبان اور معاشرت کو اختیار کر کے چینی قوم میں ایسی جذب ہوئیں کہ آج ان کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا، جس طرح ہندوستان میں مسلمانوں سے پہلے بہت سی قومیں آئیں اور یہاں کی زبان و معاشرت اختیار کر کے اپنے قومی وجود کو کھو بیٹھیں، اسی طرح اگر مسلمان بھی اردو زبان کو کھو دیں تو یہ گویا ہندوستان کی کان نمک میں ان کے نمک بن جانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہوگا ــــ اردو کی یہ اہمیت مسلمانوں کے سوا ہندوستان کی کسی دوسری قوم کے لیے نہیں ہے۔ دوسری قوموں کے لیے یہ محض اظہار خیال کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔ مگر اس کو چھوڑ کر بھی وہ اپنے قومی وجود کو برقرار رکھ سکتی ہیں۔

ان تمہیدی گذارشات کو نظر میں رکھیے اور اس کے بعد دیکھیے کہ زبان کے مسئلہ سے سیاسی اغراض کے لیے کیا کام لیا گیا ہے اور اب کیا کام لیا جا رہا ہے۔

ہمارے غیر ملکی حکمرانوں نے انگریزی زبان کو سرکاری زبان اور ذریعہ تعلیم قرار دے کر جو "شاہ ضرب" (Master stroke) لگائی تھی اس کا اثر آپ دیکھ چکے ہیں۔ انہوں نے غلاموں کی زبان (ورناکیولر) کو مٹایا نہیں۔ اسے بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کی اس کو زندہ رہنے کا حق بالکل اسی طرح عطا کر دیا جس طرح کراچی کے ریزولیوشن میں "بنیادی حقوق" کے سلسلہ میں عطا کیا گیا ہے۔ انہوں نے بس اتنا کیا کہ ذریعہ تعلیم بدل دیا اور صرف اس زبان کے جاننے والوں کے لیے ترقی کے دروازے بند کر دیے۔ سو سال کی مدت کسی قوم کی زندگی میں کوئی بڑی مدت نہیں ہوتی مگر آپ دیکھیے کہ صرف سو ہی سال کے اندر اس پالیسی کا کیا انجام ہوا ہے۔ ہم انگریزی پر ٹوٹ پڑے ہمارے تعلیم یافتہ لوگ اپنی زبان سے، اور اس کے ساتھ اپنے ماضی سے، اپنی قومی روایات سے اپنے لٹریچر سے، اپنی تہذیب و تمدن سے اور اپنے خیالات کے خزانوں سے بیگانہ ہوتے چلے گئے

انگریزی زبان اپنے ساتھ ایک غیر قوم کے خیالات بھی لیے ہوئے ان کے دل و دماغ میں گھستی چلی گئی، اور اس نے ان کو اندر سے بدلنا شروع کیا، یہاں تک کہ وہی مقصد تقریباً حاصل ہوگیا جس کو پیشِ نظر رکھکر میکالے اور اس کے ہم خیال لوگوں نے یہ شاہ ضرب لگائی تھی یعنی اُس زبان کے ذریعہ سے ایک ایسی قوم پیدا ہوگی جو رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہوگی مگر روح کے اعتبار سے انگریز ہوجائیگی۔

"ہندوستانی قومیت" کے معمار بھی انہی استادوں کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے قومیت کو بنانے اور بگاڑنے کی تدبیریں انہی سے سیکھی ہیں۔ ان کے استاد اور مورث جس کھیتی کو گذشتہ سو برس سے تیار کرتے رہے ہیں اسی کی فصل اب یہ کاٹنا چاہتے ہیں، اور چونکہ یہ غیر ملکی نہیں ہیں، اسی ملک کے لوگ ہیں لہٰذا ان کے لیے وہ انقلاب برپا کرنا زیادہ آسان ہے، جس کی جرأت ان کے استاد نہیں کرسکتے تھے اس لیے کہ وطن کی مشترک فلاح و بہبود چاہنے والے "قوم پرست" بن کر یہ سب کچھ کرسکتے ہیں، خود ہماری قوم کے لوگوں کو فریب میں مبتلا کرسکتے ہیں، اور کوئی ان کو ٹوکنے کی جرأت نہیں کرسکتا، تاوقتیکہ اس میں "ٹوڈی" اور "رجعت پسند" اور "سامراج پرست" کے گھناونے القاب سننے کی جرأت نہ ہو۔

آزادیِ ہند کے سب سے بڑے علمبردار مہاتما گاندھی جی اُس تحریک کے بھی سب سے بڑے علمبردار ہیں جس کا مقصد ہندی کو دیوناگری رسم الخط کے ساتھ ہندوستان کی "قومی زبان" بنانا ہے۔ وہ اور ان کے مددگار ــــ جو سب کے سب جنگِ آزادی کے جنرل ہیں ــــ اپنے اُس تمام اثر اور قوت کو اس کام کے لیے استعمال کر رہے ہیں جو انھیں ہندوستان کی مشترک فلاح و بہبود کے لیے جد و جہد کرنے والے "مجاہدینِ حریت" ہونے کی حیثیت سے حاصل ہوتا ہے۔ خدانخواستہ ان کا مقصد یہ نہیں کہ اردو زبان اور اس کے رسم الخط کو مٹائیں۔ ان کا مقصد تو صرف یہ ہے ــــ اور یہ بالکل پاک مقصد ہے ــــ کہ ہندی زبان کو دیوناگری رسم الخط کے ساتھ ہندوستان کی "قومی زبان"

بنا دیں۔ اگر اس کا نتیجہ عملاً وہی ہو جو اردو زبان کو مٹانے کی کوشش کا ہو سکتا ہے تو کوئی حرج نہیں اس لیے کہ کانگریس کے شعبۂ اسلامیات کے معتمد ڈاکٹر محمد اشرف صاحب ہم کو اپنے ایک سرکاری کمنٹ میں یقین دلا رہے ہیں کہ گاندھی جی کو ایسا کرنے کا پورا حق ہے اور ان کا یہ فعل "فرقہ پرستی" نہیں ہے۔ ہاں اس کے مقابلہ میں کچھ کہنا ضرور "فرقہ پرستی" ہے!

گاندھی جی کا خیال یہ ہے کہ ہندی زبان ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہیے۔ ("ہریجن" بحوالہ ٹریبیون مورخہ ۸ رجولائی ۱۹۳۷ء) مگر یہ بات وہ "ہندو فرقہ پرست" ہونے کی حیثیت سے نہیں کہتے، اور نہ اس میں وہ رجحان پایا جاتا ہے جسے پنڈت جواہر لال اپنے ایک تازہ مضمون میں "علیحدگی پسندی کے رجحان" (Separatist tendency) سے تعبیر کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو، مسلمان اور دوسری قوموں کو ملا کر جو قوم بنانا پیش نظر ہے اس کی زبان ہندی ہو اور رسم الخط ہندوستانی۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے وہ طریق کار اختیار کیا ہے جو ایک ٹھیٹھ "قوم پرست" کو اختیار کرنا چاہیے۔ وہ جب کانگریس میں تشریف لاتے ہیں تو ہندوستان کی مشترک "قومی زبان" کا نام "ہندوستانی" رکھتے ہیں جس کے دو رسم الخط ہیں یعنی فارسی اور دیوناگری، اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان دونوں رسم الخطوں کے ساتھ "ہندوستانی" کو سرکاری زبان ہونا چاہیے۔ مگر جب ہندی سمیلن میں تشریف لے جاتے ہیں تو اسی قومی زبان کا نام "ہندی" ہو جاتا ہے اور اس کے دو رسم الخط یعنی فارسی اور دیوناگری قرار پاتے ہیں۔ مدراس میں ہندی سمیلن کا جو اجلاس ہوا تھا اس میں گاندھی جی نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"صرف ہندی زبان میں جس کا بعد میں جا کر دوسرا نام ہندوستانی اور اردو بھی پڑ گیا اور جو دیوناگری اور اردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اس کی صلاحیت تھی اور ہے کہ وہ

ہمارے ملک کی مشترک زبان قرار دی جائے" (ملاحظہ ہو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے شعبۂ اطلاعات سیاسی و معیشتی کا کمیونک)

اسی رجحان کے تحت "ہندی ہندوستانی" کی اصطلاح وضع کی گئی اور پھر اس کا نام "ہندی اتھوا ہندوستانی" (ہندی یعنی ہندوستانی) ہوگیا۔

ایک دوسرے موقع پر بھارتیہ ساھتیہ پریشد (دفاق ادبیات ہند) کے اجلاس منعقدہ مدراس میں گاندھی جی نے جو تقریر فرمائی اس کے حسب ذیل فقرے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے شعبۂ اطلاعات سیاسی و معیشتی کے سرکاری بیان سے نقل کیے جاتے ہیں جن سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ "فرقہ پرستی" کے برخلاف "قوم پرستی" کس طرح کام کرتی ہے :-

"میں نے آج نہیں بلکہ ۱۹۱۸ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر کی حیثیت سے ہندی بولنے والی دنیا کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ ہم لوگ ہندی کے مفہوم کو اتنا وسیع کردیں کہ اس کی تعریف میں اردو آجائے۔ جب ۱۹۳۵ء میں میں نے دوسری بار سمیلن کی صدارت کی تو میں نے "ہندی" اصطلاح کی باضابطہ طور پر اس طرح تعریف کی کہ ہندی اس زبان کا نام ہے جسے ہندو اور مسلمان دونوں بولتے ہیں اور جو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اس توضیح سے میرا منشا یہ تھا کہ ہندی زبان بیک وقت مولانا شبلی کی فصیح و بلیغ اردو، اور پنڈت شیام سندر داس کی فصیح و بلیغ ہندی پر مشتمل ہو"۔

"اس کے بعد بھارتیہ ساھتیہ پریشد کا زمانہ لیجیے جو ہندی سمیلن کی ضمنی تحریک ہے۔ اس کے اجلاس میں میری سفارش پر ہندی کے بجائے ہندی ہندوستانی کی اصطلاح اختیار کی گئی۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس اجلاس میں میری پرزور مخالفت کی، مگر میں ان کی تجویز نہ ماننے کے لیے مجبور تھا۔ اگر مولوی صاحب کی تجویز کے مطابق میں ہندی

کے لفظ کو نکال دیتا تو یہ میرے اور سمیلن کے اوپر ظلم تھا۔ اس لیے کہ یہ لفظ ہندی سمیلن والوں کا دیا ہوا تھا اور وہ میری سفارش پر ہندی کی تعریف میں اردو کو داخل کر چکے تھے۔ اس بات کو بھی ذہن میں رکھیے کہ "ہندی" لفظ کچھ ہندوؤں کی اختراع نہیں ہے یہ نام مسلمانوں کی آمد کے بعد پڑا ہے اور اس سے مراد وہ زبان ہے جو اس وقت شمالی ہند کے ہندو مسلمان بولتے اور لکھتے پڑھتے تھے۔ لاتعداد مشہور و معروف مسلمان مصنفوں نے اپنی مادری زبان کو "ہندی" نام سے یاد کیا ہے۔ پھر اب جبکہ ہندی زبان کی حد بندی میں ہندو اور مسلمان دونوں کی ہر قسم کی تحریری اور تقریری زبان شامل ہے تو لفظوں کے اختلاف پر یہ ہنگامہ اور غوغا کیوں ہے؟

اس بحث کا ایک پہلو اور بھی سوچنے کے قابل ہے۔ جہاں تک جنوبی ہند کی زبانوں کا تعلق ہے، وہ صرف ایسی ہندی سے لاگ کھا سکتی ہیں جس میں سنسکرت کے الفاظ کی ملاوٹ ہو اس لیے کہ یہ زبانیں سنسکرت کے بعض الفاظ اور سنسکرت آوازوں سے مانوس ہیں۔"

اب آپ کے سامنے ہندوستان کی "قومی زبان" کے ارتقا کا وہ پورا نقشہ آجاتا ہے جو "قومیت ہند" کے اس معمار عظیم کے پیش نظر ہے۔ اس نقشہ کے مطابق :۔

پہلا مرحلہ یہ ہے کہ "ہندی" کے دامن کو پھیلا کر "اردو" کو اس میں سمیٹ لیا جائے۔ اردو کے علیحدہ نام سے جو امتیاز ان دونوں زبانوں میں پیدا ہوتا ہے وہ محض ذرا سے تبدیل نام کے ساتھ مٹا دیا جائے اور ان دونوں کو ملا کر ایک نام "ہندی" سے موسوم کیا جائے تاکہ یہ تخیل زندہ نہ ہو سکے کہ یہ دو الگ زبانیں ہیں۔ (اس مقصد کے لیے اس تاریخی واقعہ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ قدیم زمانہ میں مسلمانوں نے "اردو" کو "ہندی" کے نام سے موسوم کیا تھا

حالانکہ یہ پرانا واقعہ زمانۂ حال کی اس حقیقت پر کوئی اثر نہیں ڈالتا کہ اِس وقت یہ دو زبانیں دو الگ ناموں اور الگ رسم الخطوں کے ساتھ دو مستقل زبانیں ہیں۔]

دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ جنوبی ہند کی زبانوں سے تعلق پیدا کرنے کی خاطر اردو کو آہستہ آہستہ ہندی سے قریب لایا جائے۔ اس میں ہندی اسالیب بیان سنسکرت الفاظ اور سنسکرت آوازیں پیدا کی جائیں، اور اس طرح وہ "ہندی" کا دامن اردو کو ساتھ لیے ہوئے سکڑنا شروع ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے اسالیب بیان اور اپنے ذخیرۂ الفاظ اور آوازوں کی حد تک کوئی علیحدہ زبان نہ رہے بلکہ ہندی کے وجود میں تحلیل ہو کر رہ جائے۔

تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جب اردو اس طور پر ہندی میں تحلیل ہو جائے تو رفتہ رفتہ رسم الخط کے امتیاز کو بھی دور کر دیا جائے۔ سر دست رسم الخط کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔ کراچی ریڈیو لیوشن کے کھلونے سے اردو والے دل بہلاتے رہیں۔ "حب قوم پرستی" بڑھے گی اور اس کے اثر سے زبان کے الفاظ اور آوازوں میں تغیر پیدا ہوگا تو آہستہ آہستہ رسم الخط خود بدل جائے گا۔

ان تینوں مرحلوں کو اگر آپ ایک مثال کے ذریعہ سے سمجھنا چاہتے ہیں تو یوں سمجھیے کہ پہلے عبداللہ کا نام پرمیشری داس رکھ دیا جائے۔ جب وہ اس پر کان کھڑے کرے تو اس سے کہا جائے کہ میاں محض لفظوں کے اختلاف پر ہنگامہ اور غوغا کیوں برپا کرتے ہو؟ پرمیشری داس کے معنی بھی تو وہی ہیں جو عبداللہ کے ہیں۔ صرف الفاظ ہی تو بدلتے ہیں معنی میں تو کوئی فرق نہیں آتا۔ جب وہ اس طرح سمجھانے پر مان جائے تو پھر اسے یہ سمجھایا جائے کہ بھائی پرمیشری داس ذرا سر پر چوٹی رکھ لو، کبھی کبھی دھوتی باندھ لیا کرو، اپنا یہی بھوجن جو تم کھاتے ہو تپل پر رکھ کر کھانے لگو۔ اس میں کوئی حرج تو ہے نہیں۔ اور فائدہ یہ ہے کہ ان کروڑوں کی آبادی جس کے ساتھ تمہارا رہنا سہنا اور مرنا جینا ہے، اس سے تمہاری اجنبیت دور ہو جائے گی۔ جب پرمیشری داس صاحب اس معقول

تجویز کو بھی مان لیں تو پھر ان کو زیادہ نہ چھیڑو۔ آہستہ آہستہ اسی راستہ پر انھیں بڑھنے دو۔ اگر وہ نہیں تو ان کے صاحبزادے دہرم چند (جو شائد پہلے قمرالدین ہوتے) یا ان کے پوتے رام پیارے (جو حبیب اللہ ہوتے اگر یہ چال نہ چلی جاتی) خودبخود شدھ پیدا ہوں گے۔ بغیر اس کے کہ ان کی شدھی کے لیے شنکراچاریہ آف شاردھا پیٹھ کی مدد حاصل کی جائے ـــــ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا کرنے کی اس سے بہتر تدبیر اور کیا ہو سکتی ہے؟

مہاتما گاندھی کے کارنامے کی روداد ختم کرنے سے پہلے میں اس "ہندی" (یعنی ہندی اور اردو کے مرکب) کا ایک نمونہ بھی پیش کردوں جس میں مہاتما جی کے بقول "یہ صلاحیت تھی اور ہے کہ وہ ہمارے ملک کی مشترک زبان قرار دی جائے۔ بھارتیہ ساھتیہ پرشد کے اجلاس ناگپور منعقدہ ۲۴ اپریل ۱۹۳۵ء کی صدارت کرتے ہوے انہوں نے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں:۔

"اس سبھا کا سبھاپتیتو مجھے دینے کا کارن جب میں ڈھونڈتا ہوں تو دوہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساھتیہ کار نہ ہونا اور اس لیے کم سے کم دوش کا کارن ہونا۔ تھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔ جو کچھ ہو، میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے اور بھوشیہ میں اپنا سیوا اکشیتر بڑھاویں گے۔ یدی ہم سری نگر سے لیکر کنیا کماری تک اور کراچی سے لیکر ڈبروگڑھ تک جو پردیش ہے اسے ایک مانتے ہیں اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساھتیہ کار بھاشا شاستری اتیادی آپس میں کیوں نہ ملیں اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی تیھایوگیہ سیوا کیوں نہ کریں۔ (رسالہ جامعہ مورخہ مئی ۱۹۳۶ء)

یہ ہے وہ "ہندی" جس کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ "اردو" اس کی تعریف میں آجاتی ہے۔ (باقی)